© rasailojaraid.com

تفہیم القرآن

النّجم

(۳)

اب ذرا بتاؤ، تم نے کبھی اِس لات، اور اِس عُزّیٰ، اور تیسری ایک اور دیوی منات کی حقیقت پر کچھ غور بھی کیا؟[۱۵] کیا بیٹے تمہارے لیے ہیں اور بیٹیاں خدا کے لیے؟[۱۶] یہ تو پھر بڑی دھاندلی

---

[۱۵] مطلب یہ ہے کہ جو تعلیم محمد صلی اللہ علیہ وسلم تم کو دے رہے ہیں اُس کو تو تم لوگ گمراہی اور بدراہی قرار دیتے ہو، حالانکہ یہ علم ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے دیا جا رہا ہے اور اللہ ان کو آنکھوں سے وہ حقائق دکھا چکا ہے جن کی شہادت وہ تمہارے سامنے دے رہے ہیں۔ اب ذرا تم خود دیکھو کہ جن عقائد کی پیروی پر تم اصرار کیے چلے جا رہے ہو وہ کس قدر غیر معقول ہیں، اور اِن کے مقابلے میں جو شخص تمہیں سیدھا راستہ بتا رہا ہے اس کی مخالفت کر کے آخر تم کس کا نقصان کر رہے ہو۔ اس سلسلے میں خاص طور پر اُن تین دیویوں کو بطورِ مثال لیا گیا ہے جن کو مکہ، طائف، مدینہ، اور نواحِ حجاز کے لوگ سب سے زیادہ پُوجتے تھے۔ ان کے بارے میں سوال کیا گیا ہے کہ کبھی تم نے عقل سے کام لیکر سوچا بھی کہ زمین و آسمان کی خدائی کے معاملات میں ان کا کوئی ادنیٰ سا دخل بھی ہو سکتا ہے؟ یا خداوندِ عالم سے واقعی ان کا کوئی رشتہ ہو سکتا ہے؟

لات کا استھان طائف میں تھا اور بنی ثقیف اس کے اِس حد تک معتقد تھے کہ جب اَبرہہ ہاتھیوں کی فوج لے کر خانۂ کعبہ کو توڑنے کے لیے مکہ پر چڑھائی کرنے جا رہا تھا اس وقت ان لوگوں نے محض اپنے اس معبُود کے آستانے کو بچانے کی خاطر اُس ظالم کو مکے کا راستہ بتانے کے لیے بدرقے فراہم کیے تاکہ وہ لات کو ہاتھ نہ لگائے، حالانکہ تمام اہلِ عرب کی طرح ثقیف کے لوگ بھی یہ مانتے تھے کہ کعبہ اللہ کا گھر ہے۔ لات کے معنی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں اہلِ علم کے درمیان اختلاف ہے۔ ابن جریر طَبَری کی تحقیق یہ ہے کہ یہ اللہ کی تانیث ہے، یعنی اصل میں یہ لفظ اللّٰہۃ تھا جسے اللّات کر دیا گیا۔ زَمَخشری کے نزدیک یہ لَوَی یَلوِی سے مشتق ہے، جس کے معنی مُڑنے اور کسی کی طرف جھکنے کے ہیں۔ چونکہ مشرکین عبادت کے لیے اس کی طرف رجوع کرتے اور اس کے آگے جُھکتے اور اس کا طواف کرتے تھے اس لیے اس کو لات کہا جانے لگا۔ ابن عباسؓ اس کو لاتّ بتشدیدِ تا پڑھتے ہیں اور اسے لَتّ یَلُتّ سے مشتق قرار دیتے ہیں جس کے معنی متھنے اور لتھیڑنے کے ہیں۔ اُن کا اور مجاہد کا بیان ہے کہ یہ دراصل ایک شخص تھا جو طائف کے قریب ایک چٹان پر رہتا تھا اور حج کے لیے جانے والوں کو ستو پلاتا اور کھانا کھلاتا تھا۔ جب وہ مر گیا تو لوگوں نے اسی چٹان پر اس کا استھان بنا لیا اور اس کی عبادت کرنے لگے۔ مگر لات کی یہ تشریح ابن عباس اور مجاہد جیسے بزرگوں سے مروی ہونے کے باوجود دو وجوہ سے قابلِ قبول نہیں ہے۔ ایک یہ کہ قرآن میں اسے لات کہا گیا ہے نہ کہ لاتّ۔ دوسرے یہ کہ قرآن مجید ان تینوں کو دیویاں بتا رہا ہے، اور اس روایت کی رو سے لات مرد تھا نہ کہ عورت۔

عُزّیٰ عزیز کی تانیث ہے جس کے معنی عزت والی کے ہیں۔ یہ قریش کی خاص دیوی تھی اور اس کا استھان مکہ اور طائف کے درمیان وادیٔ نخلہ میں حُراض کے مقام پر واقع تھا (نخلہ کی جائے وقوع کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد چہارم صفحہ ۶۱۸ - ۶۱۹)۔ بنی ہاشم کے حلیف قبیلۂ بنی شَیبان کے لوگ اس کے مجاور تھے۔ قریش اور دوسرے قبائل کے لوگ اس کی زیارت کرتے اور اس پر نذریں چڑھاتے اور اس کے لیے قربانیاں کرتے تھے۔ کعبہ کی طرح اس کی طرف بھی ہَدْی کے جانور لے جائے جاتے اور تمام بتوں سے بڑھ کر اس کی عزت کی جاتی تھی۔ ابنِ ہِشام کی روایت ہے کہ ابو اُحیحہ جب مرنے لگا تو ابو لہب اس کی عیادت کے لیے گیا۔ دیکھا کہ وہ رو رہا ہے۔ ابو لہب نے کہا کیوں روتے ہو ابو اُحَیحہ؟ کیا موت سے ڈرتے ہو؟ حالانکہ وہ سب ہی کو آنی ہے۔ اس نے کہا خدا کی قسم مَیں موت سے ڈر کر نہیں روتا، بلکہ مجھے یہ غم کھائے جا رہا ہے کہ میرے بعد عُزّیٰ کی پُوجا کیسے ہو گی۔ ابو لہب بولا، اس کی پُوجا نہ تمہاری زندگی میں تمہاری خاطر ہوتی تھی اور نہ تمہارے بعد اسے چھوڑا جائے گا۔ ابو اُحیحہ نے کہا اب مجھے اطمینان ہو گیا کہ میرے بعد کوئی میری جگہ سنبھالنے والا ہے۔

مناۃ کا استھان مکہ اور مدینہ کے درمیان بحرِ احمر کے کنارے قُدَید کے مقام پر تھا اور خاص طور پر خُزاعہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی تقسیم ہوئی! دراصل یہ کچھ نہیں ہیں مگر بس چند نام جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے رکھ لیے ہیں اللہ نے ان کے لیے کوئی سند نازل نہیں کی[۱۷]۔ حقیقت یہ ہے کہ لوگ محض وہم و گمان کی پیروی کر رہے ہیں اور خواہشاتِ نفس کے مُرید بنے ہوئے ہیں[۱۸]۔ حالانکہ ان کے رب کی طرف سے اُن کے پاس ہدایت آچکی ہے[۱۹]۔

اور اَوس اور خَزرَج کے لوگ اس کے بہت معتقد تھے۔ اس کا حج اور طواف کیا جاتا اور اس پر نذر کی قربانیاں چڑھائی جاتی تھیں۔ زمانۂ حج میں جب حُجّاج طوافِ بیت اللہ اور عرفات اور منیٰ سے فارغ ہو جاتے تو وہیں سے مناۃ کی زیارت کے لیے لبیک لبیک کی صدائیں بلند کر دی جاتیں اور جو لوگ اِس دوسرے "حج" کی نیت کر لیتے وہ صفا اور مروہ کے درمیان سعی نہ کرتے تھے۔

۱۶ یعنی اِن دیویوں کو تم نے اللہ رب العٰلمین کی بیٹیاں قرار دے لیا اور یہ بیہودہ عقیدہ ایجاد کرتے وقت تم نے یہ بھی نہ سوچا کہ اپنے لیے تو تم بیٹی کی پیدائش کو ذلت سمجھتے ہو اور چاہتے ہو کہ تمہیں اولادِ نرینہ ملے، مگر اللہ کے لیے تم اولاد بھی تجویز کرتے ہو تو بیٹیاں!

۱۷ یعنی تم جن کو دیوی اور دیوتا کہتے ہو وہ نہ دیویاں ہیں اور نہ دیوتا، نہ ان کے اندر اُلوہیت کی کوئی صفت پائی جاتی ہے، نہ خدائی کے اختیارات کا کوئی ادنیٰ سا حصہ انہیں حاصل ہے۔ تم نے بطورِ خود ان کو خدا کی اولاد اور معبود اور خدائی میں شریک ٹھیرا لیا ہے۔ خدا کی طرف سے کوئی سند ایسی نہیں آئی ہے جسے تم اپنے اِن مفروضات کے ثبوت میں پیش کر سکو۔

۱۸ بالفاظِ دیگر اُن کی گمراہی کے بنیادی وجوہ دو ہیں۔ ایک یہ کہ وہ کسی چیز کو اپنا عقیدہ اور دین بنانے کے لیے علمِ حقیقت کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کرتے بلکہ محض قیاس و گمان سے ایک بات فرض کر لیتے ہیں اور پھر اس پر اس طرح ایمان لے آتے ہیں کہ گویا وہی حقیقت ہے۔ دوسرے یہ کہ انہوں نے یہ رویّہ دراصل اپنی خواہشاتِ نفس کی پیروی میں اختیار کیا ہے۔ اُن کا دل یہ چاہتا ہے کہ کوئی ایسا معبود موجود ہو جو دنیا میں اُن کے کام تو بناتا رہے اور آخرت اگر پیش آنے والی ہی ہو تو وہاں انہیں بخشوانے کا ذمّہ بھی لے لے، مگر حرام و حلال کی کوئی پابندی ان پر نہ لگائے اور اخلاق کے کسی ضابطے میں ان کو نہ کسے۔ اسی لیے وہ انبیاء کے لائے ہوئے طریقے پر خدائے واحد کی بندگی کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے اور اِن خود ساختہ معبودوں اور معبودنیوں کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ا ع کیا انسان جو کچھ چاہے اس کے لیے وہی حق ہے[20]؟ دنیا اور آخرت کا مالک تو اللہ ہی ہے ع

آسمانوں میں کتنے ہی فرشتے موجود ہیں، ان کی شفاعت کچھ بھی کام نہیں آسکتی جب تک کہ اللہ کسی ایسے

شخص کے حق میں اس کی اجازت نہ دے جس کے لیے وہ کوئی عرضداشت سننا چاہے اور اس کو پسند کرے[21]۔

مگر جو لوگ آخرت کو نہیں مانتے وہ فرشتوں کو دیویوں کے ناموں سے موسوم کرتے ہیں[22]۔ حالانکہ اس معاملہ کا

عبادت ہی ان کو پسند آتی ہے۔

۱۹؎ یعنی ہر زمانے میں انبیاء علیہم السلام اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان گمراہ لوگوں کو حقیقت بتاتے رہے ہیں اور اب محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے آکر ان کو بتا دیا ہے کہ کائنات میں دراصل خدائی کس کی ہے۔

۲۰؎ اس آیت کا دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کیا انسان کو یہ حق ہے کہ جس کو چاہے معبود بنالے؟ اور ایک تیسرا مطلب یہ بھی لیا جا سکتا ہے کہ کیا انسان اِن معبودوں سے اپنی مرادیں پالینے کی جو تمنا رکھتا ہے وہ کبھی پوری ہو سکتی ہے؟

۲۱؎ یعنی تمام فرشتے مل کر بھی اگر کسی کی شفاعت کریں تو وہ اس کے حق میں نافع نہیں ہو سکتی، کجا کہ تمہارے اِن بناوٹی معبودوں کی شفاعت کسی کی بگڑی بنا سکے۔ خدائی کے اختیارات سارے کے سارے بالکل اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔ فرشتے بھی اس کے حضور کسی کی سفارش کرنے کی اُس وقت تک جسارت نہیں کر سکتے جب تک وہ انہیں اس کی اجازت نہ دے اور کسی کے حق میں اُن کی سفارش سننے پر راضی نہ ہو۔

۲۲؎ یعنی ایک حماقت تو اُن کی یہ ہے کہ اِن بے اختیار فرشتوں کو جو اللہ تعالیٰ سے سفارش تک کرنے کا یارا نہیں رکھتے انہوں نے معبود بنا لیا ہے۔ اس پر مزید حماقت یہ کہ وہ انہیں عورتیں سمجھتے ہیں اور ان کو خدا کی بیٹیاں قرار دیتے ہیں۔ ان ساری جہالتوں میں ان کے مبتلا ہونے کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ وہ آخرت کو نہیں مانتے۔ اگر وہ آخرت کے ماننے والے ہوتے تو کبھی ایسی غیر ذمہ دارانہ باتیں نہ کر سکتے تھے۔ انکارِ آخرت نے انہیں انجام سے بے فکر بنا دیا ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ خدا کو ماننے یا نہ ماننے، یا ہزاروں خدا مان بیٹھنے سے کوئی فرق نہیں ہوتا، کیونکہ اِن میں سے کسی عقیدے کا بھی کوئی اچھا یا بُرا نتیجہ دنیا کی موجودہ زندگی میں نکلتا نظر نہیں آتا۔ منکرینِ خدا ہوں یا مشرکین یا موحدین، سب کی کھیتیاں پکتی بھی ہیں اور جلتی بھی ہیں۔ سب بیمار بھی ہوتے ہیں اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کوئی علم انہیں حاصل نہیں ہے، وہ محض گمان کی پیروی کر رہے ہیں[۲۳]، اور گمان حق کی جگہ کچھ بھی کام نہیں دے سکتا۔

پس اے نبی، جو شخص ہمارے ذکر سے منہ پھیرتا ہے[۲۴]، اور دنیا کی زندگی کے سوا جسے کچھ مطلوب نہیں ہے، اُسے اس کے حال پر چھوڑ دو[۲۵]۔ ——— اِن لوگوں کا مبلغِ علم بس یہی کچھ ہے[۲۶]۔ یہ بات تیرا رب ہی

تندرست بھی ہوتے رہتے ہیں۔ ہر طرح کے اچھے اور بُرے حالات سب پر گزرتے ہیں۔ اس لیے ان کے نزدیک یہ کوئی بڑا اہم اور سنجیدہ معاملہ نہیں ہے کہ آدمی کسی کو معبود مانے یا نہ مانے، یا جتنے اور جیسے چاہے معبود بنا لے۔ حق اور باطل کا فیصلہ جب ان کے نزدیک اِسی دنیا میں ہونا ہے، اور اُس کا مدار اسی دنیا میں ظاہر ہونے والے نتائج پر ہے، تو ظاہر ہے کہ یہاں کے نتائج نہ کسی عقیدے کے حق ہونے کا قطعی فیصلہ کر دیتے ہیں نہ کسی دوسرے عقیدے کے باطل ہونے کا۔ لہٰذا ایسے لوگوں کے لیے ایک عقیدے کو اختیار کرنا اور دوسرے عقیدے کو رد کر دینا محض ایک من کی موج کا معاملہ ہے۔

۲۳؎ یعنی ملائکہ کے متعلق یہ عقیدہ انہوں نے کچھ اس بنا پر اختیار نہیں کیا ہے کہ انہیں کسی ذریعۂ علم سے یہ معلوم ہو گیا ہے کہ وہ عورتیں ہیں اور خدا کی بیٹیاں ہیں، بلکہ انہوں نے محض اپنے قیاس و گمان سے ایک بات فرض کر لی ہے اور اس پر یہ آستانے بنائے بیٹھے ہیں جن سے مرادیں مانگی جا رہی ہیں اور نذریں اور نیازیں ان پر چڑھائی جا رہی ہیں۔

۲۴؎ ذکر کا لفظ یہاں کئی معنی دے رہا ہے۔ اس سے مراد قرآن بھی ہو سکتا ہے، محض نصیحت بھی مراد ہو سکتی ہے، اور اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ خدا کا ذکر سننا ہی جسے گوارا نہیں ہے۔

۲۵؎ یعنی اُس کے پیچھے نہ پڑو اور اُسے سمجھانے پر اپنا وقت ضائع نہ کرو، کیونکہ ایسا شخص کسی ایسی دعوت کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ ہو گا جس کی بنیاد خدا پرستی پر ہو، جو دنیا کے مادّی فائدوں سے بلند تر مقاصد اور اقدار کی طرف بلاتی ہو، اور جس میں اصل مطلوب آخرت کی ابدی فلاح و کامرانی کو قرار دیا جا رہا ہو۔ اس قسم کے مادہ پرست اور خدا بیزار انسان پر اپنی محنت صرف کرنے کے بجائے توجہ اُن لوگوں کی طرف کرو جو خدا کا ذکر سننے کے لیے تیار ہوں اور دنیا پرستی کے مرض میں مبتلا نہ ہوں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

زیادہ جانتا ہے کہ اُس کے راستے سے کون بھٹک گیا ہے اور کون سیدھے راستے پر ہے، اور زمین اور آسمانوں کی ہر چیز کا مالک اللہ ہی ہے[۲۸] ــــــــــ تاکہ اللہ بُرائی کرنے والوں کو ان کے عمل کا بدلہ دے[۲۹] اور اُن لوگوں کو اچھی جزا سے نوازے جنہوں نے نیک رویّہ اختیار کیا ہے، جو بڑے بڑے گناہوں[۳۰] اور کھلے کھلے قبیح افعال[۳۱] سے پرہیز کرتے ہیں، اِلّا یہ کہ کچھ قصور اُن سے سرزد ہو جائے۔[۳۲]

---

۲۶ یہ جملۂ معترضہ ہے جو سلسلۂ کلام کو بیچ میں توڑ کر پچھلی بات کی تشریح کے طور پر ارشاد فرمایا گیا ہے۔

۲۷ یعنی یہ لوگ دنیا اور اس کے فوائد سے آگے نہ کچھ جانتے ہیں نہ سوچ سکتے ہیں، اس لیے ان پر محنت صرف کرنا لاحاصل ہے۔

۲۸ بالفاظ دیگر کسی آدمی کے گمراہ یا برسرِ ہدایت ہونے کا فیصلہ نہ اِس دنیا میں ہونا ہے، نہ اس کا فیصلہ دنیا کے لوگوں کی راے پر چھوڑا گیا ہے۔ اس کا فیصلہ تو اللہ کے ہاتھ میں ہے، وہی زمین و آسمان کا مالک ہے، اور اسی کو یہ معلوم ہے کہ دنیا کے لوگ جن مختلف راہوں پر چل رہے ہیں اُن میں سے ہدایت کی راہ کون سی ہے اور ضلالت کی راہ کون سی۔ لہٰذا تم اس بات کی کوئی پروا نہ کرو کہ یہ مشرکینِ عرب اور یہ کفارِ مکہ تم کو بہکا اور بھٹکا ہوا آدمی قرار دے رہے ہیں اور اپنی جاہلیت ہی کو حق اور ہدایت سمجھ رہے ہیں۔ یہ اگر اپنے اِسی زعمِ باطل میں مگن رہنا چاہتے ہیں تو اِنہیں مگن رہنے دو۔ اِن سے بحث و تکرار میں وقت ضائع کرنے اور سر کھپانے کی کوئی ضرورت نہیں۔

۲۹ یہاں سے پھر وہی سلسلۂ کلام شروع ہو جاتا ہے جو اُوپر سے چلا آ رہا تھا۔ گویا جملۂ معترضہ کو چھوڑ کر سلسلۂ عبارت یُوں ہے: "اُسے اس کے حال پر چھوڑ دو تاکہ اللہ برائی کرنے والوں کو ان کے عمل کا بدلہ دے"۔

۳۰ تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد اوّل، ص ۳۴۶-۳۴۷۔

۳۱ تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد اوّل، ص ۵۹۹۔ جلد دوم، ص ۵۶۶

۳۲ اصل الفاظ ہیں اِلَّا اللَّمَمَ۔ عربی زبان میں لَمَم کا لفظ کسی چیز کی تھوڑی سی مقدار، یا اُس کے خفیف سے اثر، یا اُس کے محض قُرب، یا اُس کے ذرا سی دیر رہنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ مثلاً کہتے ہیں اَلَمَّ بِالْمَکَانِ، وہ شخص فلاں جگہ تھوڑی دیر ہی ٹھیرا، یا تھوڑی دیر کے لیے ہی وہاں گیا۔ اَلَمَّ بِالطَّعَامِ، اس نے تھوڑا سا کھانا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کھایا ۔ بہ لمم، اس کا دماغ ذرا سا کھسکا ہوا ہے، یا اس میں کچھ جنون کی لٹک ہے ۔ یہ لفظ اس معنی میں بولتے ہیں کہ ایک شخص نے ایک فعل کا ارتکاب تو نہیں کیا مگر ارتکاب کے قریب تک پہنچ گیا ۔ فرّاء کا قول ہے کہ میں نے عربوں کو اس طرح کے فقرے بولتے سنا ہے ضربہ مالمم القتل، فلاں شخص نے اسے اتنا مارا کہ بس مار ڈالنے کی کسر رہ گئی ۔ اور اَلَمَّ یفعل، قریب تھا کہ فلاں شخص یہ فعل کر گزرتا ۔ شاعر کہتا ہے اَلَمَّتْ فحیّت ثم قامت فودعت، وہ بس ذرا کی ذرا آئی، سلام کیا، اٹھی اور رخصت ہو گئی ۔

ان استعمالات کی بنا پر اہلِ تفسیر میں سے بعض نے لمم سے مراد چھوٹے گناہ لیے ہیں، بعض نے اس کا مطلب یہ لیا ہے کہ آدمی عملاً کسی بڑے گناہ کے قریب تک پہنچ جائے مگر اس کا ارتکاب نہ کرے، بعض اسے کچھ دیر کے لیے گناہ میں مبتلا ہونے اور پھر اس سے باز آ جانے کے معنی میں لیتے ہیں، اور بعض کے نزدیک اس سے مراد یہ ہے کہ آدمی گناہ کا خیال، یا اس کی خواہش، یا اس کا ارادہ تو کرے مگر عملاً کوئی اقدام نہ کرے ۔ اس سلسلے میں صحابہ و تابعین کے اقوال حسبِ ذیل ہیں:

زید بن اسلم اور ابنِ زید کہتے ہیں، اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا بھی ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد وہ معاصی ہیں جن کا ارتکاب اسلام سے پہلے جاہلیت کے زمانے میں لوگ کر چکے تھے، پھر اسلام قبول کرنے کے بعد انہوں نے اسے چھوڑ دیا ۔

ابن عباس کا دوسرا قول یہ ہے، اور یہی حضرت ابو ہریرہؓ، حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ، مجاہدؒ، حسن بصریؒ اور ابو صالح کا قول بھی ہے کہ اس سے مراد آدمی کا کسی بڑے گناہ یا کسی فحش فعل میں کچھ دیر کے لیے، یا احیاناً مبتلا ہو جانا اور پھر اسے چھوڑ دینا ہے ۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور مسروق اور شعبی فرماتے ہیں اور حضرت ابو ہریرہ اور حضرت عبداللہ بن عباس سے بھی معتبر روایات میں یہ قول منقول ہوا ہے کہ اس سے مراد آدمی کا کسی بڑے گناہ کے قریب تک پہنچ جانا اور اس کے ابتدائی مدارج تک طے کر گزرنا مگر آخری مرحلے پر پہنچ کر رک جانا ہے ۔ مثلاً کوئی شخص چوری کے لیے جائے، مگر چرانے سے باز رہے ۔ یا اجنبیہ سے اختلاط کرے، مگر زنا کا اقدام نہ کرے ۔

حضرت عبداللہ بن زبیر، عکرمہ، قتادہ اور ضحاک کہتے ہیں کہ اس سے مراد وہ چھوٹے چھوٹے گناہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بلاشبہ تیرے رب کا دامنِ مغفرت بہت وسیع ہے[۳۳]۔ وہ تمہیں اس وقت سے خوب جانتا ہے جب

ہیں جن کے لیے دنیا میں بھی کوئی سزا مقرر نہیں کی گئی ہے اور آخرت میں بھی جن پر عذاب دینے کی کوئی وعید نہیں فرمائی گئی ہے۔

سعید بن المسیّب فرماتے ہیں کہ اس سے مراد ہے گناہ کا خیال دل میں آنا مگر عملاً اس کا ارتکاب نہ کرنا۔ یہ حضراتِ صحابہ و تابعین کی مختلف تفسیریں ہیں جو روایات میں منقول ہوئی ہیں۔ بعد کے مفسرین اور ائمہ و فقہاء کی اکثریت اس بات کی قائل ہے کہ یہ آیت اور سورۂ نساء کی آیت ۳۱ صاف طور پر گناہوں کو دو بڑی اقسام پر تقسیم کرتی ہیں، ایک کبائر، دوسرے صغائر، اور یہ دونوں آیتیں انسان کو امید دلاتی ہیں کہ اگر وہ کبائر اور فواحش سے پرہیز کرے تو اللہ تعالیٰ صغائر سے درگزر فرمائے گا۔ اگرچہ بعض اکابر علماء نے یہ خیال بھی ظاہر کیا ہے کہ کوئی معصیت چھوٹی نہیں ہے بلکہ خدا کی معصیت بجائے خود کبیرہ ہے۔ لیکن جیسا کہ امام غزالیؒ نے فرمایا ہے، کبائر اور صغائر کا فرق ایک ایسی چیز ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ جن ذرائع معلومات سے احکامِ شریعت کا علم حاصل ہوتا ہے وہ سب اس کی نشاندہی کرتے ہیں۔

اب رہا یہ سوال کہ صغیرہ اور کبیرہ گناہوں میں فرق کیا ہے اور کس قسم کے گناہ صغیرہ اور کس قسم کے کبیرہ ہیں، تو اس معاملہ میں جس بات پر ہمارا اطمینان ہے وہ یہ ہے کہ "ہر وہ فعل گناہِ کبیرہ ہے جسے کتاب و سنت کی کسی نصّ صریح نے حرام قرار دیا ہو، یا اُس کے لیے اللہ اور اس کے رسول نے دنیا میں کوئی سزا مقرر کی ہو، یا اُس پر آخرت میں عذاب کی وعید سنائی ہو، یا اس کے مرتکب پر لعنت کی ہو، یا اس کے مرتکبین پر نزولِ عذاب کی خبر دی ہو" ——————— اس نوعیت کے گناہوں کے ماسوا جتنے افعال بھی شریعت کی نگاہ میں ناپسندیدہ ہیں وہ سب صغائر کی تعریف میں آتے ہیں۔ اسی طرح کبیرہ کی محض خواہش یا اس کا ارادہ بھی کبیرہ نہیں بلکہ صغیرہ ہے۔ حتیٰ کہ کسی بڑے گناہ کے ابتدائی مراحل طے کر جانا بھی اُس وقت تک گناہ کبیرہ نہیں ہے جب تک آدمی اس کا ارتکاب نہ کر گزرے۔ البتہ گناہ صغیرہ بھی ایسی حالت میں کبیرہ ہو جاتا ہے جبکہ وہ دین کے استخفاف اور اللہ تعالیٰ کے مقابلہ میں استکبار کے جذبہ سے کیا جائے، اور اس کا مرتکب اُس شریعت کو کسی اعتناء کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اُس نے زمین سے تمہیں پیدا کیا اور جب تم اپنی ماؤں کے پیٹوں میں ابھی جنین ہی تھے۔ پس اپنے نفس کی پاکی کے دعوے نہ کرو، وہی بہتر جانتا ہے کہ واقعی متقی کون ہے ؏۲

پھر اے نبی، تم نے اُس شخص کو بھی دیکھا جو راہِ خدا سے پھر گیا اور تھوڑا سا دے کر رک گیا[۳۴]۔ کیا اس کے پاس غیب کا علم ہے کہ وہ حقیقت کو دیکھ رہا ہے[۳۵]؟ کیا اُسے اُن باتوں کی کوئی خبر نہیں پہنچی جو موسیٰ کے صحیفوں اور اُس ابراہیم کے صحیفوں میں بیان ہوئی ہیں جس نے وفا کا حق ادا کر دیا[۳۶]؟

لائق نہ سمجھے جس نے اسے ایک بُرائی قرار دیا ہے۔

۳۳۔ یعنی صغائر کے مرتکب کا معاف کر دیا جانا کچھ اس وجہ سے نہیں ہے کہ صغیرہ گناہ، گناہ نہیں ہے، بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے ساتھ تنگ نظری اور خوردہ گیری کا معاملہ نہیں فرماتا۔ بندے اگر نیکی اختیار کریں، اور کبائر و فواحش سے اجتناب کرتے رہیں تو وہ اُن کی چھوٹی چھوٹی باتوں پر گرفت نہ فرمائے گا اور اپنی رحمتِ بے پایاں کی وجہ سے ان کو ویسے ہی معاف کر دے گا۔

۳۴۔ اشارہ ہے وَلید بن مُغیرہ کی طرف جو قریش کے بڑے سرداروں میں سے ایک تھا۔ ابن جریر طبری کی روایت ہے کہ یہ شخص پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت قبول کرنے پر آمادہ ہو گیا تھا۔ مگر جب اس کے ایک مشرک دوست کو معلوم ہوا کہ وہ مسلمان ہونے کا ارادہ کر رہا ہے تو اس نے کہا کہ تم دینِ آبائی کو نہ چھوڑو، اگر تمہیں عذابِ آخرت کا خطرہ ہے تو مجھے اتنی رقم دے دو، میں ذمہ لیتا ہوں کہ تمہارے بدلے وہاں کا عذاب میں بھگت لونگا۔ ولید نے یہ بات مان لی اور خدا کی راہ پر آتے آتے اُس سے پھر گیا۔ مگر جو رقم اس نے اپنے مشرک دوست کو دینی طے کی تھی وہ بھی بس تھوڑی سی دی اور باقی روک لی۔ اس واقعہ کی طرف اشارہ کرنے سے مقصود کفارِ مکہ کو یہ بتانا تھا کہ آخرت سے بے فکری اور دین کی حقیقت سے بے خبری نے ان کو کیسی جہالتوں اور حماقتوں میں مبتلا کر رکھا ہے۔

۳۵۔ یعنی کیا اسے معلوم ہے کہ یہ روش اس کے لیے نافع ہے؟ کیا وہ جانتا ہے کہ آخرت کے عذاب سے کوئی اس طرح بھی بچ سکتا ہے؟

۳۶۔ آگے اُن تعلیمات کا خلاصہ بیان کیا جا رہا ہے جو حضرت موسیٰؑ اور حضرت ابراہیمؑ کے صحیفوں میں نازل ہوئی تھیں۔ حضرت موسیٰؑ کے صحیفوں سے مراد توراۃ ہے۔ رہے حضرت ابراہیمؑ کے صحیفے تو وہ آج دنیا میں کہیں موجود

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

"یہ کہ کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا[۳۷]،

اور یہ کہ انسان کے لیے کچھ نہیں ہے مگر وہ جس کی اس نے سعی کی ہے[۳۸]۔

نہیں ہیں، اور یہود و نصاریٰ کی کتبِ مقدسہ میں بھی اُن کا کوئی ذکر نہیں پایا جاتا۔ صرف قرآن ہی وہ کتاب ہے جس میں دو مقامات پر صحفِ ابراہیمؑ کی تعلیمات کے بعض اجزاء نقل کیے گئے ہیں، ایک یہ مقام، دوسرے سورۂ الاعلیٰ کی آخری آیات۔

۳۷؎ اِس آیت سے تین بڑے اصول مستنبط ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ ہر شخص خود اپنے فعل کا ذمہ دار ہے۔ دوسرے یہ کہ ایک شخص کے فعل کی ذمہ داری دوسرے پر نہیں ڈالی جاسکتی الّا یہ کہ اُس فعل کے صُدور میں اس کا اپنا کوئی حصّہ ہو۔ تیسرے یہ کہ کوئی شخص اگر چاہے بھی تو کسی دوسرے شخص کے فعل کی ذمہ داری اپنے اوپر نہیں لے سکتا، نہ اصل مجرم کو اس بنا پر چھوڑا جاسکتا ہے کہ اس کی جگہ سزا بھگتنے کے لیے کوئی اور آدمی اپنے آپ کو پیش کر رہا ہے۔

۳۸؎ اس ارشاد سے بھی تین اہم اصول نکلتے ہیں۔ ایک یہ کہ ہر شخص جو کچھ بھی پائے گا اپنے عمل کا پھل پائے گا۔ دوسرے یہ کہ ایک شخص کے عمل کا پھل دوسرا نہیں پاسکتا، الّا یہ کہ اُس عمل میں اُس کا اپنا کوئی حصّہ ہو۔ تیسرے یہ کہ کوئی شخص سعی و عمل کے بغیر کچھ نہیں پاسکتا۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس آیت کی رُو سے ایک شخص کا عمل دوسرے شخص کے لیے کسی صورت میں بھی نافع نہیں ہوسکتا؟ اور کیا ایک شخص اگر دوسرے شخص کے لیے یا اُس کے بدلے کوئی عمل کرے تو وہ اس کی طرف سے قبول نہیں کیا جاسکتا؟ اور کیا یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ ایک شخص اپنے عمل کے اجر کو دوسرے کی طرف منتقل کرسکے؟

ان سوالات کا جواب اگر نفی میں ہو تو ایصالِ ثواب اور حجِ بدل وغیرہ سب ناجائز ہو جاتے ہیں، بلکہ دوسرے کے حق میں دعا تے استغفار بھی بے معنی ہو جاتی ہے، کیونکہ یہ دعا بھی اُس شخص کا اپنا عمل نہیں ہے جس کے حق میں دعا کی جائے۔ مگر یہ انتہائی نقطۂ نظر معتزلہ کے سوا اہلِ اسلام میں سے کسی نے اختیار نہیں کیا ہے۔ صرف وہ اِس آیت کا یہ مطلب لیتے ہیں کہ ایک شخص کی سعی دوسرے کے لیے کسی حال میں بھی نافع نہیں ہوسکتی۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بخلاف اس کے اہلِ سنّت ایک شخص کے لیے دوسرے کی دعا کے نافع ہونے کو تو بالاتفاق مانتے ہیں، کیونکہ وہ قرآن سے ثابت ہے، البتہ ایصالِ ثواب اور نیابۃً دوسرے کی طرف سے کسی نیک کام کے نافع ہونے میں ان کے درمیان اصولاً نہیں بلکہ صرف تفصیلات میں اختلاف ہے۔

(۱) ایصالِ ثواب یہ ہے کہ ایک شخص کوئی نیک عمل کر کے اللہ سے دعا کرے کہ اس کا اجر و ثواب کسی دوسرے شخص کو عطا فرما دے۔ اس مسئلے میں امام مالکؒ اور امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ خالص بدنی عبادات، مثلاً نماز، روزہ اور تلاوتِ قرآن وغیرہ کا ثواب دوسرے کو نہیں پہنچ سکتا، البتہ مالی عبادات، مثلاً صدقہ، یا مالی و بدنی مرکّب عبادات، مثلاً حج کا ثواب دوسرے کو پہنچ سکتا ہے، کیونکہ اصل یہ ہے کہ ایک شخص کا عمل دوسرے کے لیے نافع نہ ہو، مگر چونکہ احادیثِ صحیحہ کی رُو سے صدقہ کا ثواب پہنچایا جا سکتا ہے اور حجّ بدل کیا جا سکتا ہے، اس لیے ہم اسی نوعیت کی عبادات تک ایصالِ ثواب کی صحت تسلیم کرتے ہیں۔ بخلاف اس کے حنفیہ کا مسلک یہ ہے کہ انسان اپنے ہر نیک عمل کا ثواب دوسرے کو ہبہ کر سکتا ہے خواہ وہ نماز ہو یا روزہ یا تلاوتِ قرآن یا ذکر یا صدقہ یا حج و عمرہ۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ آدمی جس طرح مزدوری کر کے مالک سے یہ کہہ سکتا ہے کہ اس کی اجرت میرے بجائے فلاں شخص کو دے دی جائے، اسی طرح وہ کوئی نیک عمل کر کے اللہ تعالیٰ سے یہ دعا بھی کر سکتا ہے کہ اس کا اجر میری طرف سے فلاں شخص کو عطا کر دیا جائے۔ اس میں بعض اقسام کی نیکیوں کو مستثنیٰ کرنے اور بعض دوسری اقسام کی نیکیوں تک اسے محدود رکھنے کی کوئی معقول وجہ نہیں ہے۔ یہی بات بکثرت احادیث سے بھی ثابت ہے:

بخاری، مسلم، مُسند احمد، ابن ماجہ، طبرانی (فی الاوسط)، مستدرک اور ابنِ ابی شیبہ میں حضرت عائشہ، حضرت ابو ہریرہ، حضرت جابر بن عبد اللہ، حضرت ابو رافع، حضرت ابو طلحہ انصاری، اور حذیفہ بن اُسید الغفاری کی متفقہ روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے دو مینڈھے لے کر ایک اپنی اور اپنے گھر والوں کی طرف سے قربان کیا اور دوسرا اپنی امت کی طرف سے۔

مسلم، بخاری، مسند احمد، ابو داؤد اور نسائی میں حضرت عائشہ کی روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سے عرض کیا کہ میری ماں کا اچانک انتقال ہو گیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اگر انہیں بات کرنے کا موقع

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ملتا تو وہ ضرور صدقہ کرنے کے لیے کہتیں۔ اب اگر میں ان کی طرف سے صدقہ کروں تو کیا ان کے لیے اجر ہے؟ فرمایا ہاں۔

مُسند احمد میں حضرت عبداللہ بن عَمرو بن العاص کی روایت ہے کہ ان کے دادا عاص بن وائل نے زمانہ جاہلیت میں سو اونٹ ذبح کرنے کی نذر مانی تھی۔ ان کے چچا ہشام بن العاص نے اپنے حصّے کے پچاس اونٹ ذبح کر دیئے حضرت عَمرو بن العاص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سے پوچھا کہ میں کیا کروں۔ حضورؐ نے فرمایا اگر تمہارے باپ نے توحید کا اقرار کر لیا تھا تو تم ان کی طرف سے روزہ رکھو یا صدقہ کرو، وہ ان کے لیے نافع ہوگا۔

مُسند احمد، ابوداؤد، نسائی اور ابنِ ماجہ میں حضرت حسن بصری کی روایت ہے کہ حضرت سعد بن عُبادہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سے پوچھا کہ میری والدہ کا انتقال ہو گیا ہے، کیا میں ان کی طرف سے صدقہ کروں؟ آپؐ نے فرمایا ہاں۔ اسی مضمون کی متعدد دوسری روایات بھی حضرت عائشہ، حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت ابن عباس سے بخاری، مسلم، مُسند احمد، نسائی، ترمذی، ابوداؤد اور ابن ماجہ وغیرہ میں موجود ہیں جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے میّت کی طرف سے صدقہ کرنے کی اجازت دی ہے اور اسے میّت کے لیے نافع بتایا ہے۔

دارقُطنی میں ہے کہ ایک شخص نے حضورؐ سے عرض کیا میں اپنے والدین کی خدمت ان کی زندگی میں تو کرتا ہوں، ان کے مرنے کے بعد کیسے کروں؟ فرمایا "یہ بھی ان کی خدمت ہی ہے کہ ان کے مرنے کے بعد تو اپنی نماز کے ساتھ ان کے لیے بھی نماز پڑھے اور اپنے روزوں کے ساتھ ان کے لیے بھی روزے رکھے۔ ایک دوسری روایت دارقطنی میں حضرت علیؓ سے مروی ہے جس میں وہ بیان کرتے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا جس شخص کا قبرستان پر گزر ہو اور وہ گیارہ مرتبہ قل ھو اللہ احد پڑھ کر اس کا اجر مرنے والوں کو بخش دے تو جتنے مُردے ہیں اتنا ہی اجر عطا کر دیا جائیگا۔

یہ کثیر روایات جو ایک دوسری کی تائید کر رہی ہیں، اس امر کی تصریح کرتی ہیں کہ ایصالِ ثواب نہ صرف ممکن ہے، بلکہ ہر طرح کی عبادات اور نیکیوں کے ثواب کا ایصال ہو سکتا ہے اور اس میں کسی خاص نوعیت کے اعمال کی تخصیص نہیں ہے۔ مگر اس سلسلے میں چار باتیں اچھی طرح سمجھ لینی چاہییں:

ایک یہ کہ ایصال اُسی عمل کے ثواب کا ہو سکتا ہے جو خالصتہً اللہ کے لیے اور قواعدِ شریعت کے مطابق کیا گیا ہو، ورنہ ظاہر ہے کہ غیر اللہ کے لیے یا شریعت کے خلاف جو عمل کیا جائے اس پر خود عمل کرنے والے ہی کو کسی قسم کا ثواب نہیں مل سکتا، کجا کہ وہ کسی دوسرے کی طرف منتقل ہو سکے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دوسری بات یہ ہے کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کے ہاں صالحین کی حیثیت سے مہمان ہیں ان کو تو ثواب کا ہدیہ یقیناً پہنچے گا مگر جو وہاں مجرم کی حیثیت سے حوالات میں بند ہیں انہیں کوئی ثواب پہنچنا متوقع نہیں ہے۔ اللہ کے مہانوں کو ہدیہ تو پہنچ سکتا ہے، مگر امید نہیں کہ اللہ کے مجرم کو تحفہ پہنچ سکے۔ اس کے لیے اگر کوئی شخص کسی غلط فہمی کی بنا پر ایصالِ ثواب کرے گا تو اس کا ثواب ضائع نہ ہوگا بلکہ مجرم کو پہنچنے کے بجائے اصل عامل ہی کی طرف پلٹ آئیگا۔ جیسے منی آرڈر اگر مُرسَل الیہ کو نہ پہنچے تو مُرسِل کو واپس مل جاتا ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ ایصالِ ثواب تو ممکن ہے مگر ایصالِ عذاب ممکن نہیں ہے یعنی یہ تو ہو سکتا ہے کہ آدمی نیکی کر کے کسی دوسرے کے لیے اجر بخش دے اور وہ اس کو پہنچ جائے، مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ آدمی گناہ کر کے اس کا عذاب کسی کو بخشے اور وہ اسے پہنچ جائے۔

اور چوتھی بات یہ ہے کہ نیک عمل کے دو فائدے ہیں۔ ایک اس کے وہ نتائج جو عمل کرنے والے کی اپنی روح اور اس کے اخلاق پر مترتب ہوتے ہیں اور جن کی بنا پر وہ اللہ کے ہاں بھی جزا کا مستحق ہوتا ہے۔ دوسرے اس کا وہ اجر جو اللہ تعالیٰ بطورِ انعام اسے دیتا ہے۔ ایصالِ ثواب کا تعلق پہلی چیز سے نہیں ہے بلکہ صرف دوسری چیز سے ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص ورزش کر کے کشتی کے فن میں مہارت حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اِس سے جو طاقت اور مہارت اس میں پیدا ہوتی ہے وہ بہر حال اس کی ذات ہی کے لیے مخصوص ہے۔ دوسرے کی طرف وہ منتقل نہیں ہو سکتی۔ اِسی طرح اگر وہ کسی دربار کا ملازم ہے اور پہلوان کی حیثیت سے اس کے لیے ایک تنخواہ مقرر ہے تو وہ بھی اسی کو ملے گی، کسی اور کو نہ دے دی جائے گی۔ البتہ جو انعامات اس کی کارکردگی پر خوش ہو کر اس کا سرپرست اسے دے اس کے حق میں وہ درخواست کر سکتا ہے کہ وہ اس کے استاد، یا ماں باپ، یا دوسرے محسنوں کو اس کی طرف سے دے دیئے جائیں۔ ایسا ہی معاملہ اعمالِ حسنہ کا ہے کہ ان کے روحانی فوائد قابلِ انتقال نہیں ہیں، اور ان کی جزا بھی کسی کو منتقل نہیں ہو سکتی، مگر ان کے اجر و ثواب کے متعلق وہ اللہ تعالیٰ سے دعا کر سکتا ہے کہ وہ اس کے کسی عزیز قریب یا اس کے کسی محسن کو عطا کر دیا جائے۔ اسی لیے اِس کو ایصالِ جزا نہیں بلکہ ایصالِ ثواب کہا جاتا ہے۔

(۲) ایک شخص کی سعی کے کسی اور شخص کے لیے نافع ہونے کی دوسری شکل یہ ہے کہ آدمی یا تو دوسرے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی خواہش اور ایما کی بنا پر اس کے لیے کوئی نیک عمل کرے، یا اس کی خواہش اور ایما کے بغیر اُس کی طرف سے کوئی ایسا عمل کرے جو دراصل واجب تو اس کے ذمہ تھا مگر وہ خود اسے ادا نہ کر سکا۔ اس کے بارے میں فقہاءِ حنفیہ کہتے ہیں کہ عبادات کی تین قسمیں ہیں۔ ایک خالص بدنی، جیسے نماز۔ دوسری خالص مالی، جیسے زکوٰۃ۔ اور تیسری مالی و بدنی مرکب، جیسے حج۔ ان میں سے پہلی قسم میں نیابت نہیں چل سکتی، مثلاً ایک شخص کی طرف سے دوسرا شخص نیابۃً نماز نہیں پڑھ سکتا۔ دوسری قسم میں نیابت ہو سکتی ہے، مثلاً بیوی کے زیورات کی زکوٰۃ شوہر دے سکتا ہے۔ تیسری قسم میں نیابت صرف اُس حالت میں ہو سکتی ہے جبکہ اصل شخص، جس کی طرف سے کوئی فعل کیا جا رہا ہے، اپنا فریضہ خود ادا کرنے سے عارضی طور پر نہیں بلکہ مستقل طور پر عاجز ہو۔ مثلاً حجِ بدل ایسے شخص کی طرف سے ہو سکتا ہے جو خود حج کے لیے جانے پر قادر نہ ہو اور نہ یہ امید ہو کہ وہ کبھی اس کے قابل ہو سکے گا۔ مالکیہ اور شافعیہ بھی اس کے قائل ہیں۔ البتہ امام مالک حجِ بدل کے لیے یہ شرط لگاتے ہیں کہ اگر باپ نے وصیت کی ہو کہ اُس کا بیٹا اس کے بعد اُس کی طرف سے حج کرے تو وہ حجِ بدل کر سکتا ہے ورنہ نہیں۔ مگر احادیث اس معاملہ میں بالکل صاف ہیں کہ باپ کا ایما یا وصیت ہو یا نہ ہو، بیٹا اس کی طرف سے حجِ بدل کر سکتا ہے۔

ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ قبیلۂ خَثْعَم کی ایک عورت نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ میرے باپ کو فریضۂ حج کا حکم ایسی حالت میں پہنچا ہے کہ وہ بہت بوڑھا ہو چکا ہے، اونٹ کی پیٹھ پر بیٹھ نہیں سکتا۔ آپؐ نے فرمایا فحجی عنہ، "تو اس کی طرف سے حج کر لے" (بخاری، مسلم، احمد، ترمذی، نسائی)۔ قریب قریب اسی مضمون کی روایت حضرت علیؓ نے بھی بیان کی ہے (احمد، ترمذی)۔

حضرت عبداللہ بن زُبیرؓ قبیلۂ خثعم ہی کے ایک مرد کا ذکر کرتے ہیں کہ اس نے بھی اپنے بوڑھے باپ کے متعلق یہی سوال کیا تھا۔ حضورؐ نے پوچھا کیا تو اس کا سب سے بڑا لڑکا ہے؟ اس نے عرض کیا جی ہاں۔ فرمایا ارأیت لو کان علی ابیک دین فقضیتہ عنہ اکان یجزی ذالک عنہ؟ "تیرا کیا خیال ہے، اگر تیرے باپ پر قرض ہو اور تو اُس کو ادا کر دے تو وہ اس کی طرف سے ادا ہو جائے گا؟" اس نے عرض کیا جی ہاں۔ فرمایا فَاحْجُجْ عنہ "بس اسی طرح تو اس کی طرف سے حج بھی کر لے"۔ (احمد۔ نسائی)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ابن عباس کہتے ہیں کہ قبیلۂ جُہَینہ کی ایک عورت نے آکر عرض کیا کہ میری ماں نے حج کرنے کی نذر مانی تھی مگر وہ اس سے پہلے ہی مرگئی، اب کیا میں اس کی طرف سے حج کرسکتی ہوں ؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا "تیری ماں پر اگر قرض ہوتا تو کیا تو اس کو ادا نہ کرسکتی تھی ؟ اسی طرح تم لوگ اللہ کا حق بھی ادا کرو، اور اللہ اس کا زیادہ مستحق ہے کہ اس کے ساتھ کیے ہوئے عہد پورے کیے جائیں" (بخاری۔ نسائی)۔ بخاری اور مُسند احمد میں ایک دوسری روایت یہ ہے کہ ایک مرد نے آکر اپنی بہن کے بارے میں وہی سوال کیا جو اوپر مذکور ہوا ہے اور حضورؐ نے اس کو بھی یہی جواب دیا۔

ان روایات سے مالی و بدنی مرکّب عبادات میں نیابت کا واضح ثبوت ملتا ہے۔ رہیں خالص بدنی عبادات تو بعض احادیث ایسی ہیں جن سے اس نوعیت کی عبادات میں بھی نیابت کا جواز ثابت ہوتا ہے۔ مثلاً ابن عباس کی یہ روایت کہ قبیلۂ جُہَینہ کی ایک عورت نے حضورؐ سے پوچھا "میری ماں نے روزے کی نذر مانی تھی اور وہ پوری کیے بغیر مرگئی، کیا میں اس کی طرف سے روزہ رکھ سکتی ہوں ؟" حضورؐ نے فرمایا "اس کی طرف سے روزہ رکھ لے" (بخاری، مسلم، احمد، نسائی، ابوداؤد)۔ اور حضرت بُریدہؓ کی یہ روایت کہ ایک عورت نے اپنی ماں کے متعلق پوچھا کہ اُس کے ذمہ ایک مہینے (یا دوسری روایت کے مطابق دو مہینے) کے روزے تھے، کیا میں یہ روزے ادا کردوں ؟ آپ نے اس کو بھی اس کی اجازت دے دی (مسلم، احمد، ترمذی، ابوداؤد)۔ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت کہ حضورؐ نے فرمایا من مات وعلیہ صیام صام عنہ ولیّہ "جو شخص مرجائے اور اس کے ذمہ کچھ روزے ہوں تو اس کی طرف سے اس کا ولی وہ روزے رکھ لے" (بخاری، مسلم، احمد۔ بزار کی روایت میں حضورؐ کے الفاظ یہ ہیں کہ فلیصم عنہ ولیّہ ان شاء۔ یعنی اس کا ولی اگر چاہے تو اس کی طرف سے یہ روزے رکھ لے)۔ انہی احادیث کی بنا پر اصحاب الحدیث اور امام اَوزاعی اور ظاہریہ اس کے قائل ہیں کہ بدنی عبادات میں بھی نیابت جائز ہے۔ مگر امام ابوحنیفہ، امام مالک، اور امام شافعی اور امام زید بن علی کا فتویٰ یہ ہے کہ میّت کی طرف سے روزہ نہیں رکھا جاسکتا، اور امام احمد، امام لَیث اور اسحاق بن راھَوَیہ کہتے ہیں کہ صرف اس صورت میں ایسا کیا جاسکتا ہے جبکہ مرنے والے نے اس کی نذر مانی ہو اور وہ اسے پورا نہ کرسکا ہو۔ مانعین کا استدلال یہ ہے کہ جن احادیث سے اس کے جواز کا ثبوت ملتا ہے ان کے راویوں نے خود اس کے خلاف فتویٰ دیا ہے ابن عباس کا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور یہ کہ اس کی سعی عنقریب دیکھی جائے گی[۹۳] اور اس کی پُوری جزا اسے دی جائے گی،

اور یہ کہ آخر کار پہنچنا تیرے رب ہی کے پاس ہے،

اور یہ کہ اسی نے ہنسایا اور اسی نے رُلایا،[۹۴]

فتویٰ نسائی نے اِن الفاظ میں نقل کیا ہے کہ لا یصلی احد عن احد ولا یصم احد عن احد "کوئی شخص کسی کی طرف سے نہ نماز پڑھے اور نہ روزہ رکھے"۔ اور حضرت عائشہ کا فتویٰ عبدالرزاق کی روایت کے مطابق یہ ہے کہ لا تصوموا عن موتاکم واطعموا عنھم "اپنے مُردوں کی طرف سے روزہ نہ رکھو بلکہ کھانا کھلاؤ"۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے بھی عبدالرزاق نے یہی بات نقل کی ہے کہ میّت کی طرف سے روزہ نہ رکھا جائے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتداءً بدنی عبادات میں نیابت کی اجازت تھی، مگر آخری حکم یہی قرار پایا کہ ایسا کرنا جائز نہیں ہے۔ ورنہ کس طرح ممکن تھا کہ جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ احادیث نقل کی ہیں وہ خود ان کے خلاف فتویٰ دیتے

اس سلسلے میں یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ نیابتہً کسی فریضہ کی ادائیگی صرف انہی لوگوں کے حق میں مفید ہو سکتی ہے جو خود ادائے فرض کے خواہشمند ہوں اور معذوری کی وجہ سے قاصر رہ گئے ہوں۔ لیکن اگر کوئی شخص استطاعت کے باوجود قصداً حج سے مجتنب رہا اور اُس کے دل میں اِس فرض کا احساس تک نہ تھا، اُس کے لیے خواہ کتنے ہی حج بدل کیے جائیں، وہ اس کے حق میں مفید نہیں ہو سکتے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے ایک شخص نے کسی کا قرض جان بوجھ کر مار رکھا یا اور مرتے دم تک اس کا کوئی ارادہ قرض ادا کرنے کا نہ تھا۔ اس کی طرف سے خواہ بعد میں پائی پائی ادا کر دی جائے، اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں وہ قرض مارنے والا ہی شمار ہو گا ———— ———— دوسرے کے ادا کرنے سے سبکدوش صرف وہی شخص ہو سکتا ہے جو اپنی زندگی میں ادائے قرض کا خواہشمند ہو اور کسی مجبوری کی وجہ سے ادا نہ کر سکا ہو۔

۹۳؎ یعنی آخرت میں لوگوں کے اعمال کی جانچ پڑتال ہو گی اور یہ دیکھا جائے گا کہ کون کیا کر کے آیا ہے۔

۹۴؎ یعنی خوشی اور غم، دونوں کے اسباب اسی کی طرف سے ہیں۔ اچھی اور بُری قسمت کا سر رشتہ اسی کے ہاتھ میں ہے۔ کسی کو اگر راحت و مسرّت نصیب ہوئی ہے تو اسی کے دینے سے ہوئی ہے۔ اور کسی کو مصائب

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور یہ کہ اسی نے موت دی اور اسی نے زندگی بخشی

اور یہ کہ اُسی نے نر اور مادہ کا جوڑا پیدا کیا ایک بُوند سے جب وہ ٹپکائی جاتی ہے[۴۱]،

اور یہ کہ دوسری زندگی بخشنا بھی اُسی کے ذمہ ہے[۴۲]،

اور یہ کہ اسی نے غنی کیا اور جائداد بخشی[۴۳]،

اور یہ کہ وہی شِعریٰ کا رب ہے[۴۴]،

آلام سے سابقہ پیش آیا ہے تو اسی کی مشیت سے پیش آیا ہے۔ کوئی دوسری ہستی اِس کائنات میں ایسی نہیں ہے جو قسمتوں کے بنانے اور بگاڑنے میں کسی قسم کا دخل رکھتی ہو۔

۴۱؎ تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد سوم، ص ۳۴۷ تا ۴۵۷، جلد چہارم، ص ۵۱۵

۴۲؎ اوپر کی دونوں آیتوں کے ساتھ ملا کر اس آیت کو دیکھا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ ترتیبِ کلام سے خود بخود حیات بعد الموت کی دلیل بھی برآمد ہو رہی ہے جو خدا موت دینے اور زندگی بخشنے پر قدرت رکھتا ہے، اور جو خدا نطفے کی حقیر سی بوند سے انسان جیسی مخلوق پیدا کرتا ہے، بلکہ ایک ہی مادۂ تخلیق و طریقِ پیدائش سے عورت اور مرد کی دو الگ صنفیں پیدا کر دکھاتا ہے، اس کے لیے انسان کو دوبارہ پیدا کرنا کچھ دشوار نہیں ہے۔

۴۳؎ اصل میں لفظ اَقْنٰی استعمال ہوا ہے جس کے مختلف معنی اہلِ لغت اور مفسرین نے بیان کیے ہیں۔ قتادہ کہتے ہیں کہ ابن عباس نے اس کے معنی اَرْضٰی (راضی کر دیا) بتائے ہیں۔ عِکرمہ نے ابنِ عباس سے اس کے معنی قَنَّعَ (مطمئن کر دیا) نقل کیے ہیں۔ امام رازی کہتے ہیں کہ آدمی کی حاجت سے زیادہ جو کچھ بھی اس کو دیا جائے وہ اِقناء ہے۔ ابوعُبَیدہ اور دوسرے متعدد اہلِ لغت کا قول ہے کہ اَقْنٰی قُنْیَۃٌ سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں باقی اور محفوظ رہنے والا مال جیسے مکان، اراضی، باغات، مواشی وغیرہ۔ ان سب سے الگ مفہوم ابن زید بیان کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اَقْنٰی یہاں اَفْقَرَ (فقیر کر دیا) کے معنی میں ہے اور آیت کا مطلب یہ ہے کہ اس نے جس کو چاہا غنی کیا اور جسے چاہا فقیر کر دیا۔

۴۴؎ شِعریٰ آسمان کا روشن ترین تارا ہے جسے مِرْزَمُ الجوزاء، الکلب الاکبر، الکلب الجبّار، الشِعریٰ المعبور وغیرہ ناموں سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ انگریزی میں اس کو SIRIUS اور DOG STAR اور CANIS MAJORIS

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور یہ کہ اُسی نے عادِ اُولیٰ[۵۰] کو ہلاک کیا، اور ثمود کو ایسا مٹایا کہ ان میں سے کسی کو باقی نہ چھوڑا، اور اُن سے پہلے قومِ نوحؑ کو تباہ کیا کیونکہ وہ تھے ہی سخت ظالم و سرکش لوگ، اور اوندھی گرنے والی بستیوں کو اٹھا پھینکا، پھر چھا دیا اُن پر وہ کچھ جو (تم جانتے ہی ہو کہ) کیا چھا دیا۔[۵۱]

پس اے مخاطب، اپنے رب کی کن کن نعمتوں میں تو شک کرے گا؟[۵۲]

کہتے ہیں۔ یہ سورج سے ۲۳ گنا زیادہ روشن ہے، مگر زمین سے اس کا فاصلہ آٹھ سال نوری سے بھی زیادہ ہے اس لیے یہ سورج سے چھوٹا اور کم روشن نظر آتا ہے۔ اہلِ مصر اس کی پرستش کرتے تھے، کیونکہ اس کے طلوع کے زمانے میں نیل کا فیضان شروع ہوتا تھا، اس لیے وہ سمجھتے تھے کہ یہ اُسی کے طلوع کا فیضان ہے۔ جاہلیت میں اہلِ عرب کا بھی یہ عقیدہ تھا کہ یہ ستارہ لوگوں کی قسمتوں پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اسی بنا پر یہ عرب کے معبودوں میں شامل تھا، اور خاص طور پر قریش کا ہمسایہ قبیلہ خُزاعہ اس کی پرستش کے لیے مشہور تھا۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ تمہاری قسمتیں شِعریٰ نہیں بناتا بلکہ اُس کا رب بناتا ہے۔

۵۰؎ عادِ اُولیٰ سے مراد ہے قدیم قومِ عاد جس کی طرف حضرت ہود علیہ السلام بھیجے گئے تھے۔ یہ قوم جب حضرت ہودؑ کو جھٹلانے کی پاداش میں مبتلائے عذاب ہوئی تو صرف وہ لوگ باقی بچے جو اُن پر ایمان لائے تھے۔ ان کی نسل کو تاریخ میں عادِ اُخریٰ یا عادِ ثانیہ کہتے ہیں۔

۵۱؎ اوندھی گرنے والی بستیوں سے مراد قومِ لوطؑ کی بستیاں ہیں۔ اور "چھا دیا اُن پر جو کچھ چھا دیا" سے مراد غالباً بحرِ مُردار کا پانی ہے جو ان کی بستیوں کے زمین میں دھنس جانے کے بعد اُن پر پھیل گیا تھا اور آج تک وہ اس علاقے پر چھایا ہوا ہے۔

۵۲؎ بعض مفسرین کے نزدیک یہ فقرہ بھی صحفِ ابراہیم اور صحفِ موسیٰ کی عبارت کا ایک حصہ ہے اور بعض مفسرین کہتے ہیں کہ فَغَشّٰهَا مَا غَشّٰی پر وہ عبارت ختم ہو گئی، یہاں سے دوسرا مضمون شروع ہوتا ہے۔ سیاقِ کلام کو دیکھتے ہوئے پہلا قول ہی زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ بعد کی یہ عبارت کہ "یہ ایک تنبیہ ہے پہلے آئی ہوئی تنبیہات میں سے"، اس امر کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ اس سے پہلے کی تمام عبارت پچھلی تنبیہات میں سے ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہ ایک تنبیہ ہے پہلے آئی ہوئی تنبیہات میں سے[۴۹]۔ آنے والی گھڑی قریب آ لگی ہے[۵۰]، اللہ کے سوا

[۴۸] اصل میں لفظ تَتَمَارٰی استعمال ہوا ہے جس کے معنی شک کرنے کے بھی ہیں اور جھگڑنے کے بھی۔ خطاب ہر سامع سے ہے۔ جو شخص بھی اِس کلام کو سن رہا ہو اُس کو مخاطب کر کے فرمایا جا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو جھٹلانے اور ان کے بارے میں پیغمبروں سے جھگڑا کرنے کا جو انجام انسانی تاریخ میں ہو چکا ہے، کیا اُس کے بعد بھی تو اسی حماقت کا ارتکاب کرے گا؟ پچھلی قوموں نے یہی تو شک کیا تھا کہ جن نعمتوں سے ہم اِس دنیا میں متمتع ہو رہے ہیں یہ خدائے واحد کی نعمتیں ہیں، یا کوئی اور بھی اِن کے مہیا کرنے میں شریک ہے، یا یہ کسی کی فراہم کی ہوئی نہیں ہیں بلکہ آپ سے آپ فراہم ہو گئی ہیں۔ اسی شک کی بنا پر انہوں نے انبیاء علیہم السلام سے جھگڑا کیا تھا۔ انبیاء ان سے کہتے تھے کہ یہ ساری نعمتیں تمہیں خدا نے، اور اکیلے ایک ہی خدا نے عطا کی ہیں، اس لیے اُسی کا تمہیں شکر گزار ہونا چاہیے اور اُسی کی تم کو بندگی بجا لانی چاہیے۔ مگر وہ لوگ اس کو نہیں مانتے تھے اور اسی بات پر انبیاء سے جھگڑتے تھے۔ اب کیا تجھے تاریخ میں یہ نظر نہیں آتا کہ یہ قومیں اپنے اِس شک اور اِس جھگڑے کا کیا انجام دیکھ چکی ہیں؟ کیا تو بھی وہی شک اور وہی جھگڑا کرے گا جو دوسروں کے لیے تباہ کُن ثابت ہو چکا ہے۔

اس سلسلے میں یہ بات بھی نگاہ میں رہنی چاہیے کہ عاد اور ثمود اور قومِ نوح کے لوگ حضرت ابراہیمؑ سے پہلے گزر چکے تھے اور قومِ لوط خود حضرت ابراہیمؑ کے زمانے میں مبتلائے عذاب ہوئی تھی، اس لیے اِس عبارت کے صحفِ ابراہیم کا ایک حصہ ہونے میں کوئی اشکال نہیں ہے۔

[۴۹] اصل الفاظ ہیں هٰذَا نَذِيْرٌ مِّنَ النُّذُرِ الْاُوْلٰى۔ اِس فقرے کی تفسیر میں مفسرین کے تین اقوال ہیں۔ ایک یہ کہ نذیر سے مراد محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ دوسرے یہ کہ اس سے مراد قرآن ہے۔ تیسرے یہ کہ اس سے مراد پچھلی ہلاک شدہ قوموں کا انجام ہے جس کا حال اوپر کی آیات میں بیان فرمایا گیا ہے۔ سیاقِ کلام کے لحاظ سے ہمارے نزدیک یہی تیسری تفسیر قابلِ ترجیح ہے۔

[۵۰] یعنی یہ خیال نہ کرو کہ سوچنے سمجھنے کے لیے ابھی بہت وقت پڑا ہے، کیا جلدی ہے کہ اِن باتوں پر ہم فوراً ہی سنجیدگی کے ساتھ غور کریں اور انہیں ماننے کا بلا تاخیر فیصلہ کر ڈالیں۔ نہیں، تم میں سے کسی کو بھی یہ معلوم نہیں ہے کہ اس کے لیے زندگی کی کتنی مہلت باقی ہے۔ ہر وقت تم میں سے ہر شخص کی موت بھی آ سکتی ہے، اور قیامت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کوئی اس کو ہٹانے والا نہیں۵۱۔ اب کیا یہی وہ باتیں ہیں جن پر تم اظہار تعجب کرتے ہو؟۵۲ ہنستے ہو اور روتے نہیں ہو؟۵۳ اور گا بجا کر انہیں ٹالتے ہو؟۵۴ جھک جاؤ اللہ کے آگے اور بندگی بجا لاؤ۵۵۔ ع ۳

بھی اچانک پیش آسکتی ہے۔ اس لیے فیصلے کی گھڑی کو دور نہ سمجھو۔ جس کو بھی اپنی عاقبت کی فکر کرنی ہے وہ ایک لمحے کی تاخیر کے بغیر سنبھل جائے۔ کیونکہ ہر سانس کے بعد یہ ممکن ہے کہ دوسرا سانس لینے کی نوبت نہ آئے۔

۵۱۔ یعنی فیصلے کی گھڑی جب آجائے گی تو نہ تم اسے روک سکو گے اور نہ تمہارے معبودانِ غیر اللہ میں سے کسی کا یہ بل بوتا ہے کہ وہ اس کو ٹال سکے۔ ٹال سکتا ہے تو اللہ ہی ٹال سکتا ہے، اور وہ اسے ٹالنے والا نہیں ہے۔

۵۲۔ اصل میں لفظ ھٰذا الحدیث استعمال ہوا ہے جس سے مراد وہ ساری تعلیم ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے قرآن مجید میں پیش کی جا رہی تھی۔ اور تعجب سے مراد وہ تعجب ہے جس کا اظہار آدمی کسی انوکھی اور ناقابلِ یقین بات کو سن کر کیا کرتا ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم جس چیز کی طرف دعوت دے رہے ہیں وہ یہی کچھ ہے جو تم نے سن لی۔ اب کیا یہی وہ باتیں ہیں جن پر تم کان کھڑے کرتے ہو اور حیرت سے اس طرح منہ تکتے ہو کہ گویا کوئی بڑی عجیب اور نرالی باتیں تمہیں سنائی جا رہی ہیں؟

۵۳۔ یعنی بجائے اس کے کہ تمہیں اپنی جہالت و گمراہی پر رونا آتا، تم لوگ الٹا اس صداقت کا مذاق اڑاتے ہو جو تمہارے سامنے پیش کی جا رہی ہے۔

۵۴۔ اصل میں لفظ سَامِدُوْن استعمال ہوا ہے جس کے دو معنی اہلِ لغت نے بیان کیے ہیں۔ ابنِ عباس، عکرمہ اور ابوعبیدہ نحوی کا قول ہے کہ یمنی زبان میں سمود کے معنی گانے بجانے کے ہیں، اور آیت کا اشارہ اس طرف ہے کہ کفارِ مکہ قرآن کی آواز کو دبانے اور لوگوں کی توجہ دوسری طرف ہٹانے کے لیے زور زور سے گانا شروع کر دیتے تھے۔ دوسرے معنی ابن عباس اور مجاہد نے یہ بیان کیے ہیں کہ السمود البرطمة وھی رفع الراس تکبرًا، کانوا یمرون علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم غضبا مبرطمین یعنی سمود تکبر کے طور پر سر نیوڑھانے کو کہتے ہیں، کفارِ مکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے جب گزرتے تو غصے کے ساتھ منہ اوپر اٹھائے ہوئے نکل جاتے تھے۔ راغب اصفہانی نے مفردات میں بھی یہی معنی اختیار کیے ہیں، اور اسی معنی کے لحاظ سے سَامِدُوْن کا مفہوم قتادہ نے غافلون اور سعید بن جبیر نے معرضون بیان کیا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۵۵ امام ابو حنیفہ، امام شافعی اور اکثر اہلِ علم کے نزدیک اِس آیت پر لازماً سجدہ کرنا چاہیے۔ امام مالک اگرچہ خود اس کی تلاوت کر کے سجدے کا التزام فرماتے تھے (جیسا کہ ابن العربی نے احکام القرآن میں نقل کیا ہے)، مگر ان کا مسلک یہ تھا کہ یہاں سجدہ کرنا لازم نہیں ہے۔ ان کی اس رائے کی بنا حضرت زید بن ثابت کی یہ روایت ہے کہ "میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے سورۂ نجم پڑھی اور حضورؐ نے سجدہ نہ کیا" (بخاری، مسلم، احمد، ابو داؤد، ترمذی، نسائی)۔ لیکن یہ حدیث اس آیت پر سجدہ لازم ہونے کی کلّی نفی نہیں کرتی، کیونکہ اس بات کا احتمال ہے کہ حضورؐ نے اُس وقت کسی وجہ سے سجدہ نہ فرمایا ہو اور بعد میں کر لیا ہو۔ دوسری روایات اس باب میں صریح ہیں کہ اس آیت پر التزاماً سجدہ کیا گیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود، ابن عباس اور مُطّلِب بن ابی وَداعہ کی متفق علیہ روایات یہ ہیں کہ حضورؐ نے جب پہلی مرتبہ حرم میں یہ سورہ تلاوت فرمائی تو آپ نے سجدہ کیا اور آپ کے ساتھ مسلم و کافر سب سجدے میں گر گئے (بخاری، احمد، نسائی)۔ ابن عمر کی روایت ہے کہ حضورؐ نے نماز میں سورۂ نجم پڑھ کر سجدہ کیا اور دیر تک سجدے میں پڑے رہے (بیہقی۔ ابن مَرْدُوْیَہ)۔ سبْرۃ الجُہَنی کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے فجر کی نماز میں سورۂ نجم پڑھ کر سجدہ کیا اور پھر اٹھ کر سورۃ زلزال پڑھی اور رکوع کیا (سعید بن منصور)۔ خود امام مالک نے بھی مؤطا، باب ما جاء فی سجود القرآن میں حضرت عمرؓ کا یہ فعل نقل کیا ہے۔

© rasailojaraid.com